ڈاکٹر منظور احمد

آوازِ شکستگی: 'صدا آتی ہے تہذیبوں کے مدفن سے' ☆

مثنوی 'صدا آتی ہے تہذیبوں کے مدفن سے' فضا اعظمی کے کلام کا تازہ مجموعہ ہے جس کا ذیلی عنوان 'تصادمِ ہلال وصلیب کی نظریاتی تردید اور تشکیلِ عالمِ نو' ہے۔ پہلی نظموں کے تسلسل میں اِس طویل نظم نے فضا اعظمی صاحب کے لیے اُن دردمند اور اصلاحی شاعروں کی صف میں جگہ بنا دی ہے جس کے پہلے منادالطاف حسین حالی تھے۔ اعظمی صاحب کی دوسری نظموں کی طرح اپنے طرزِ ادا اور اثرانگیزی کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب نظم ہے۔ اعظمی صاحب کا اظہار تصنّع سے پاک، سیدھا سادا اور الفاظ کے غیرضروری استعمال سے مبرا ہے۔ جس قسم کے مضامین اِس نظم میں ادا ہوئے ہیں، اُن کے اظہار کے لیے اِس سے بہتر طریقہ شاید ممکن نہیں ہے۔ اُردو شاعری میں اِس صنفِ سخن میں فضا اعظمی صاحب نے اپنا ایک مستقل مقام بنالیا ہے۔

تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ سیموئیل ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۳ء میں ایک مضمون میں سوالیہ عنوان کے ساتھ پیش کیا تھا جو ایک امریکی رسالے 'فارن افیرز' میں چھپا تھا۔ فوراً ہی اُس پر بحث کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا جو بہت کم مضامین پر ہوتا ہے اور ۳ سال کے عرصے میں اُس پر مختلف نقطہ ہائے نظر کی طرف سے بھرپور بحث ہوتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۹۶ء میں ہینٹنگٹن نے اُس مضمون کو ساڑھے تین سو صفحوں کی ایک کتاب 'دی کلیش آف سولائزیشن اینڈ دی

☆ ادارہ طلوعِ افکار، کراچی، صفحات ۲۴۵، قیمت ۲۵۰۔

ری میکنگ آف ورلڈ آرڈر' (تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو) کی شکل میں شائع کر دیا۔ جب سے اب تک اِس نقطۂ نظر کے حامیوں اور مخالفوں کا مناقشہ جاری ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اِس نقطۂ نظر کے زبانی مخالف عملی طور پر اِس کی موافقت کرتے ہیں اور علمی طور پر اِس کے حامی دُنیا میں بھائی چارے، رواداری اور ثقافتی کثرت کا درس دیتے ہیں۔

تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کا ایک عوامی پہلو ہے اور ایک علمی۔ علمی پہلو کو سمجھنے کے لیے انسان کو تاریخی ارتقا اور تصورات کی تاریخ (History of Ideas) سے کسی حد تک واقف ہونا چاہیے۔ تہذیبوں کے توافق اور تصادم کو صحیح سیاق میں سمجھنے کے لیے تہذیب کی ماہیت، یہ سوال کہ کیا کوئی تہذیب عالم گیر ہوسکتی ہے، یہ مسئلہ کہ اقتدار اور ثقافت میں کیا رشتہ ہے اور اقتدار ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف کن حالات اور کن عوامل کی بنا پر منتقل ہو جاتا ہے—— پھر یہ سوال کہ غیر مغربی اقوام میں مقامی تہذیبوں کی طرف رجوع کے کیا اسباب ہیں، تہذیبوں کا اُن کے سیاسی ڈھانچوں سے کیا تعلق ہے اور مختلف سیاسی نظاموں کی بنیاد تہذیب کس طرح فراہم کرتی ہے، مغربی تہذیبی یلغار اور عالم گیریت کی کوشش نے کس قسم کے تصادم کو جنم دیا ہے، مسلم جارحیت کے اسباب کیا ہیں، آئندہ مسلم جارحیت اور چینی تہذیب کی طاقت، تہذیبوں کے مابین تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہوگی—— غرض اِس طرح کے بے شمار موضوعات اور سوالات ہیں جو علمی تحقیق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اِن کا ایک جواب دینے کی ہنٹنگٹن نے کوشش کی ہے اور جس کا ردّ نہ سیاسی شخصیات کے بیانوں سے ممکن ہے اور نہ ہی عام انسان کی شدید خواہش اور تمنا کہ لوگ مل جل کر رہیں، اِس مسئلے کے حل میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ خواہش، تمنا اور آرزو کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ بجائے خود مسئلے کا حل نہیں ہے۔

ہنٹنگٹن کے نزدیک اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مغرب کو فی نفسہٖ اسلام سے کوئی عناد نہیں ہے بلکہ صرف جارح اسلام سے ہے۔ اُس کے خیال میں اسلام اور عیسائیت کی چودہ سو سالہ تاریخ اِس کے برعکس منظر نامہ پیش کرتی ہے، اس میں ہر دو تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم رہی ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی

کوشش کرتی رہی ہیں۔ بیسویں صدی میں لبرل جمہوریت اور اشتراکیت کا تصادم تو تاریخ کا ایک معمولی سانحہ معلوم ہوتا ہے، اس کے برخلاف اسلام اور عیسائیت کی جنگ تو ایک لمبی تاریخ پر محیط ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہے ہیں، لیکن ان دونوں میں ایک درونی کش مکش اور غلبہ کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوئی۔

ساتویں اور آٹھویں صدی کے نصف تک عرب اسلامی تہذیب نے شمالی افریقہ، آئبیریا، مشرقِ وسطیٰ، ایران اور شمالی ہندوستان میں غلبہ حاصل کر لیا، اس کے بعد تقریباً دو صدیوں تک اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک قسم کا ٹھہراؤ قائم ہو گیا۔ گیارھویں صدی کے آخر تک عیسائی تہذیب نے دوبارہ بحیرۂ روم کے مغربی کناروں پر تسلط قائم کر لیا اور سسلی کی فتح کے بعد طلیطلہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۹۵ء سے عیسائیت نے صلیبی جنگ کا آغاز کیا اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں بلقان، شمالی افریقہ اور قسطنطنیہ عثمانی ترکوں کے زیرِ نگیں آ گئے اور ۱۵۲۹ء میں ویانا کا محاصرہ کر لیا گیا۔ برنارڈ لیوس کا کہنا ہے: ''بربروں کے اسپین میں داخل ہونے کے بعد سے ترکوں کے ویانا کے محاصرے تک تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام یورپ کے لیے خطرے کا باعث بنا رہا۔'' مغربی مفکّرین اور مقتدر قوتوں کے نزدیک اِس وقت دُنیا میں اسلام ہی ایک ایسی تہذیب ہے جس نے عیسائی مغربی تہذب کی بقا کو کم از کم دو مرتبہ خطرے میں ڈالا ہے اور اب بھی ایک جارح تہذیب کی حیثیت سے اگر کوئی خطرہ مغرب کو درپیش ہے تو وہ اسلام سے ہے۔

پندرہویں صدی میں تاریخ نے نیا موڑ لیا اور عیسائی تہذیب نے رفتہ رفتہ آئبیریا، غرناطہ کو واپس لے لیا۔ اسی اثنا میں مغرب کی بڑھتی ہوئی بحری طاقت زمینی راستے چھوڑ کر سمندری راستے سے ہندوستان میں داخل ہو گئی۔ دوسری طرف روسیوں نے تاتاری حکومت کو ختم کر دیا۔ ترکوں نے آخری مرتبہ ۱۶۸۳ء میں ویانا کی طرف پھر پیش قدمی کرنا چاہی لیکن فوراً ہی بلقان ترکوں کے اثر سے آزاد ہو گیا۔ ایک صدی کے اندر اندر ترکی جو یورپ کے لیے قہرِ 'سماوی' سمجھا جاتا ہے، اب یورپ کا 'مردِ بیمار' بن گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر برطانیہ،

فرانس اور اٹلی نے عثمانی سلطنت پر اپنا بالواسطہ یا بلاواسطہ تسلّط قائم کر لیا سوائے اُن علاقوں کے جو ترک ری پبلک کہلائے جاتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں صرف چار مسلمان ممالک ترکی، سعودی عرب، ایران اور افغانستان ایسے رہ گئے جو آزاد کہلائے جا سکتے تھے، لیکن دُنیا میں اُن کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا تھا۔

مغربی استعمار کی پسپائی کی ابتدا بھی ۱۹۲۰ء سے شروع ہوئی اور جس میں دوسری جنگِ عظیم کے نتیجے میں تیزی آ گئی۔ سویت یونین کے انہدام نے ڈرامائی انداز میں آزاد مسلم ریاستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا کچھ اندازوں کے مطابق ۱۷۵۷ء سے ۱۹۱۹ء تک مسلم دُنیا کی ۹۲ مملکتیں مغربی استعمار کے زیرِ تسلّط آ گئی تھیں اور ۱۹۹۵ء تک ۶۹ مملکتیں واپس مسلمانوں کے قبضے میں آ چکی تھیں اور ان میں ۴۵ مملکتیں ایسی ہیں جہاں آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ۱۸۲۰ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں پچاس فی صد مسلمان اور عیسائی ممالک کے درمیان واقع ہوئیں۔

مسلمان اور عیسائی تہذیبوں کا یہ تصادم کوئی وقتی مناقشہ نہیں ہے جس کا اظہار بارہویں صدی میں عیسائی صلیبی جنگوں یا بیسویں صدی میں مسلم بنیاد پرستی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ بنیادی طور پر دو تہذیبوں اور مذہبوں کے ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی مستقل کوشش کا آئینہ دار ہے۔ معاملہ صرف ذاتی زندگی میں خدا کے ماننے یا نہ ماننے کا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ عیسائی تہذیب خدا کو خدا کا حصہ اور سیزر کو اس کا حصہ دینے کی قائل ہے جبکہ اسلامی تہذیب خدا کی حکمرانی کو دین اور دنیا دونوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ عیسائی اور مسلم تہذیب کی مماثلتیں بھی دونوں کے درمیان فاصلے کم کرنے کا ذریعہ نہیں بنتیں۔ دونوں مذاہب ایک خدا کو مانتے ہیں اور بت پرستی سے انکار کرتے ہیں اور خود کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر سمجھتے ہیں۔ دونوں اپنی تہذیب اور مذہب کو عالمگیر بنانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں غلبے کے نظریے کے قائل ہیں۔ دونوں تبلیغی مذاہب ہیں جو ساری دُنیا کو مشرف بہ اسلام یا عیسائیت کرنا چاہتے ہیں اور اس میں وہ انسانوں کی نجات سمجھتے ہیں۔ شروع ہی سے جب بھی عیسائیت اور اسلام کو موقع ملا اُنھوں

نے فتوحات کے ذریعے اپنے مذہب کے غلبے کی کوشش کی ہے۔ 'جہاد' اور 'صلیبی جنگ' کے تصورات میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں تاریخ کی دوری یا جامد نظریے کے بجائے آخرت کی طرف بڑھنے کے قائل ہیں جب ساری دُنیا پر قیامت سے پہلے ان کے مذہب کا غلبہ ہو جائے گا۔

عیسائیت اور اسلام کے تصادم کی تاریخ اور بہت سے پیچیدہ عوامل بھی رکھتی ہے اور ان کو سمجھے بغیر حقیقتِ عصر کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اُن میں ایک عامل آبادی کا اُتار چڑھاؤ اور ہجرت بھی رہا ہے، ساتویں صدی میں اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عربوں نے اتنی کثیر تعداد میں بازنطینی اور ساسانی مملکتوں کی طرف ہجرت کی جس کی نظیر ان مملکتوں کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی تھی چند صدیوں بعد صلیبی جنگوں کے اسباب بڑی حد تک معاشی ترقی اور آبادی کی افزائش اور گیارہویں صدی کے یورپ میں عیسائیت کے احیا کی تحریک تھے۔ اس احیائی تحریک کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا کہ کسانوں اور سواروں (knights) کی ایک بڑی تعداد مقدس سرزمین کی طرف مارچ کرنے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہوگئی۔ جب پہلے صلیبی قسطنطنیہ پہنچے تو ایک بازنطینی مؤرخ نے لکھا: ''ایسا لگتا تھا کہ بحیرۂ ایڈریاٹک سے ہرقل کے میناروں (جبل الطارق) تک تمام مغرب اور تمام قبیلوں نے جوق در جوق ہجرت کرنا شروع کر دی ہے اور اپنے تمام مال و متاع کے ساتھ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایشیا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' انیسویں صدی میں یورپ کی آبادی میں اضافے کے سبب ایک مرتبہ پھر اس قسم کی نقلِ مکانی کا منظر دیکھنے میں آیا، جب مغربی آبادی کی ایک کثیر تعداد نے مسلمانوں سمیت دوسری مملکتوں کی طرف ہجرت کی۔

بیسویں صدی کے آخر میں اسلام اور مغرب کی آویزش میں اور اضافہ ہو گیا، اس کی وجوہات کئی ہیں۔ مسلم ممالک میں آبادی کی کثرت سے بے روزگاری پیدا ہوئی اور لوگوں کی کثیر تعداد غیر مطمئن زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی۔ اُن میں سے کچھ نے نسبتاً امیر پڑوسیوں اور مغربی ممالک کی طرف سفر شروع کیا۔ اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اسلام نے ان کو ایک

اعلیٰ مقصد بھی فراہم کر دیا جس کی وجہ سے ان کو زندگی بامعنی معلوم ہونے لگی، اس طرح وہ ''اسلامی آئیڈیالوجی'' کے احیا میں شریک و سہیم بن گئے۔ اِس احیا کی ایک وجہ وہ ردِّعمل بھی تھا جو مغربی تہذیب کے عالم گیر عزائم کے مقابلے میں جذبے کو برانگیختہ کرنے کا سبب بنا۔ مسلمانوں نے مغرب کی اقدار اور اداروں کی یلغار کو اپنے امتیازی وجود کی بقا کے لیے خطرہ محسوس کیا۔ یہ خطرہ صرف مغربی اقدار اور اداروں کے تسلّط کا نہ تھا بلکہ طاقت ور ممالک بشمول روس، مغرب اور چین کے مسلمانوں کو بے اختیار کرنے کی کوشش کے خلاف ایک ردِّعمل بھی تھا۔ ان تمام وجوہات نے مل کر بیسویں صدی کی نویں اور دسویں دہائی میں دونوں تہذیبوں کے درمیان برداشت کی سطح کو کافی نیچا کر دیا۔

آج مغرب اور اسلام کی کش مکش میں بڑا سوال یہ ہے کہ راج کس کا ہو اور کون پرجا۔ جب تک مغربی اور اسلامی تہذیبیں ایک دوسرے پر اپنی برتری کے احساس کی حامل رہیں گی، یہ تصادم بھی برقرار رہے گا اور دونوں ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتی رہیں گی۔ اگر اُن میں کسی کو دوسرے سے خطرہ زیادہ ہوا تو پھر بقدرِ طاقت وہ ایک دوسرے کو خاک کا ڈھیر بنانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

یہ ہے اُس تصادم کا پس منظر جس سے بچنے کی کوشش مغرب اور مشرق کا ہر معصوم آدمی کرتا ہے۔ مغرب کو اپنی تہذیب پر غرّہ بھی ہے اور وہ حربی اور معاشی طاقت کا مالک ہے، اس لیے اس جنگ میں مادی فتح بھی اس کا مقدر ہے۔ اور جس طرح نازی تحریک کو اس نے طاقت سے مسمار کر دیا تھا کہ وہ ان کے لیے خطرہ بن سکتی تھی، اس طرح وہ اسلامی احیائی تحریک کو بھی زمین دوز کرنے سے نہیں چوکے گا۔

فضا اعظمی اُن 'معصومین' میں شامل ہیں جن کی شدید خواہش اس تصادم سے بچنے کی ہے اور یہی خواہش دُنیا کے ہر شاعر، ادیب، دانش ور اور بااخلاق آدمی کی ہے۔ اِن میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے پر غلبے کی کوشش ختم کریں اور ساتھ مل جل کر رہنا سیکھیں، لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ہر دو تہذیبوں کے ماننے والوں کو

اپنے چند بنیادی عقائد پر نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔ مثلاً اِس عقیدے پر کہ اُن کا مذہب اختیار کیے بغیر دنیا اور آخرت کی کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ کہ اُن کے اقداری نظام کو دُنیا میں غالب آنا چاہیے، اس لیے کہ وہ سب سے اعلیٰ اقداری نظام ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر موقع ملے تو قوتِ نافذہ کی مدد سے مذہب کو منوایا جا سکتا ہے۔ دونوں تہذیبوں کو اِس کی گنجائش پیدا کرنا ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کے عقائد کے صحیح اور غلط ثابت کرنے کے سلسلے میں طاقت کا استعمال نہ کریں۔

کیا یہ سمائی ہر دو تہذیبوں کے اُن نمائندوں میں موجود ہے جو میدان میں لنگر لنگوٹ کس کر لڑنے پر آمادہ ہیں؟ کیا اٹلی کے پرائم منسٹر کا مغربی تہذب کے متعلق دعویٰ اور اسلامی آئیڈیالوجی کا ادّعا ایک ہی دُنیا میں سُکھ کے ساتھ نباہ کر سکتے ہیں؟

یہ باتیں فضاؔ اعظمی صاحب کی مخلصانہ آرزو کے حصول کی کسی حد تک نفی کرتی نظر آتی ہیں لیکن اس بیان سے میرا منشا اِس قدر ہے کہ ہم خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ مغرب پر ہمارا بس نہیں چلے گا۔ اس کے لیے نصیحت اور فضیحت دونوں بے کار ہیں، لیکن ہم خود اپنے اُن پیش پا اُفتادہ دعوؤں پر ضرور نظرِ ثانی کر سکتے ہیں جن کو ہم بدیہی حقائق یا صداقتِ کُلّی سمجھ کر صبح شام اپنے مواعظ میں، بیانوں میں، تقریروں میں، اخبار کے صفحات میں، ریڈیو اور ٹی۔وی کی نشریات میں دُہراتے رہتے ہیں اور پھر اُن سے استخراج کے ذریعے زندگی کے ہر مسئلے پر حکم لگا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام جرأت بھی چاہتا ہے اور مشقت طلب بھی ہے۔ یہ ایک ایسی علمی سطح کا مطالبہ بھی ہے جو آج اسلامی دُنیا میں تقریباً مفقود ہے۔ یہ تخلیقی فکر کا طالب ہے جس کو ہمارے مفتیوں نے کفر کے فتوے مار مار کر بے بس اور لاچار کر دیا ہے۔ یہ ہماری تاریخ کی تفہیم پر بھی نظرِ ثانی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اِس کو بھی ہم نے دیوتا بنا کر تنقید اور تفہیم کی ہر کوشش سے ماورا کر دیا ہے۔ اگر یہ کام ہمارا دانش ور کر سکا تو شاید اگلے سو سال میں اسلامی تہذیب کا کسی نہ کسی معنی میں احیا بھی ممکن ہو سکے گا اور ساتھ ہی دوسری تہذیبوں کے ساتھ ایک مکالماتی فضا میں زندہ بھی رہ سکیں گے۔ شاید اُس وقت پھر ہم کو سیاری جنگ کی ضرورت نہیں

رہے گی:

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پایا

دینی اخلاقیات
کے
قرآنی مفاہیم

پروفیسر توشی ہیکو ازتسو

(T. Izutsu)

ترجمہ:

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

قیمت:-/375 روپے